شکریہ

عالیجناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے
پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹرایٹ لا کی کرمفرمائی کا
تہ دل سے ادا کیا جاتا ہے کہ انہوں نے
بطیب خاطر الطاف کریمانہ کو کام فرما کر اپنے
اس لکچر کے چھاپ لینے کی اجازت کا ہمیں
پورا اختیار اور ایجنسی کو کامل امتیاز بخشا۔

الشاکر
منشی فضل الٰہی مالک و پروپرائٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر

یہ بے نظیر لیکچر دراصل انگریزی زبان میں تھا جو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا لاہور نے علیگڈہ کالج میں پرنسپل کے ارشاد سے ۱۹۱۱ء میں دیا۔ اسکا اردو ترجمہ جناب مولوی ظفر علیخاں صاحب بی اے نے اپنے ماہواری رسالہ مخزن میں چھاپا تھا چونکہ یہ لیکچر مصنف اور مترجم کی قابلیت کا بہترین نمونہ ہے اسلئے دوبارہ شائع ہوتا ہے

انسانی تاریخ کے پارینہ اوراق کو لوٹتے وقت جب ہماری نظر ارتقا کی الم ریز جھلملیوں میں سے جھنکتی ہوئی ان کے رزمیہ بین السطور پر پڑتی ہے تو کسی خواب کے گریزپا نظاروں کی طرح ہم گذری ہوئی قوموں اور سلطنتوں اور تمدنوں کے کھنڈروں کو پے بہ پے نیست سے ہست اور ہست سے نیست ہوتا دیکھتے ہیں جس سے زیادہ ہیبت افزا اور حوصلہ فرسا منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ قدرت کی قوتوں (کی) نظروں میں نہ افراد کی وقعت ہے نہ اقوام کی منزلت

اس کے اٹل قوانین برابر اپنا عمل کئے جا رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسکی منزلِ مقصود بہت ہی دُور ہے جسے مقاصدِ انسانی کے آغاز و انجام سے کسی قسم کا تعلق نہیں لیکن

آدمی زادہ طرفہ معجونیت

باوجود حالات گرد و پیش کی نامساعدت کے اُسکی تخییل جو عقل کی آئینہ بردار ہے اُسے اپنی ہستی کا کامل تر جلوہ دکھا دیتی ہے اور اُن ذرائع کی دریافت پر آمادہ کرتی ہے جو اس تصویرِ مثالی میں جس کے خط و خال اُس کی شانِ اکملیت کو چھپائے ہوئے ہیں جان ڈال سکیں دُوسرے حیوانات کے مقابلہ میں انسان بہت ہی کمزور و ناتوان ہے۔ اپنے بچاؤ کے لئے وہ قدرتی حربوں سے مُسلّح نہیں کیا گیا۔ وُہ بصارتِ شبینہ سے محرُوم ہے۔ اُسکی قوتِ شامہ اور طاقتِ گریز بہت کم ہے لیکن پھر بھی زندگانی کی آزادیوں اور پہنائیوں کی جستجو میں اس نے اپنی ان تھک سرگرمیوں کو ہمیشہ سے وقف کئے رکھا ہے تاکہ قوانینِ قدرت کی کُنہ اور طرزِ عمل سے واقف ہو کر وُہ رفتہ رفتہ اُن اسباب ۔۔۔۔۔ سے

جو خود اُس کے ارتقا پر مؤثر ہیں *

قانون انتخاب طبعی کے اکتشافِ عظیم کی بدولت انسان اپنے خانوادہ کی تاریخ کا عقلی تصور قائم کرنے کے قابل ہو گیا حالانکہ پہلے اِس تاریخ کے واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک حوادث کے ایک فوق الادراک سلسلہ سے زیادہ نہ تھی جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا غایت کے فرداً فرداً یا درِ ایام کے سراپا اسرار بطن سے پیدا ہو کر گہوارہ شہود میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے۔ اس قانون کے معانی کی تنقید جب اور بھی زیادہ وقت نظر کے ساتھ کی گئی اور ان فلاسفہ نے جن کی خیال آفرینیاں ڈارون کے مقدمہ حکمت کا تتمہ ہیں جب حیات کی ہیئتِ اجتماعی کے دوسرے نمایاں حقائق کا اکتشاف کیا تو مدنی زندگی کے عمرانی اخلاقی اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کے متعلق انسان کے تصورات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہونے کی صورت نکل آئی۔

علم الحیات کے اصولوں نے حال ہی اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ فرد فی نفسہ ایک ہستیٔ اعتباری ہے یا یوں کہیے کہ اس کا نام اُن مجرداتِ عقلیہ کی قبیل سے ہے جن کا حوالہ دیگر عمرانیات کے مباحث

کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر فرد اُس جماعت کی زندگی میں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے بمنزلہ ایک عارضی و آنی لمحہ کے ہے۔ اُس کے خیالات اس کی تمنائیں، اُسکا طرز ماند و بود، اُس کے جملہ قوائے دماغی و جسمانی، بلکہ اُس کے ایام زندگانی کی تعداد تک اس جماعت کی ضروریات و حوائج کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جس کی حیاتِ اجتماعی کا وہ محض ایک جزوی مظہر ہے۔ فرد کے افعال کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ بر سبیلِ اضطرار و بلا ارادہ کسی ایک خاص کام کو جو جماعت کے نظام نے اس کے سپرد کیا ہے انجام دے دیتا ہے اور اس لحاظ سے اُس کے مقاصد کو جماعت کے مقاصد سے تخالفِ کلی بلکہ تضادِ مطلق ہے۔ جماعت کی زندگی بلا لحاظ اپنے اجزائے ترکیبی یعنی افراد کی زندگی کے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ اور جس طرح ایک جسم ذوی الاعضا مریض ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلا علم و بلا ارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو برانگیختہ کر دیتا ہے جو اسکی تندرستی کا موجب بنجاتی ہیں اسی طرح ایک قوم جو ... اثرات سے سقیم الحال ہو گئی ہو بعض

کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیا کرتی ہے۔ مثلاً قوم میں کوئی زبردست
دل و دماغ کا انسان پیدا ہو جاتا ہے یا کوئی نئی تخییل نمودار ہوتی ہے یا
ایک ہمہ گیر مذہبی اصلاح کی تحریک بروئے کار آتی ہے جس کا اثر یہ
ہوتا ہے کہ قوم کے قولئے ذہنی و روحانی تمام طاغی و سرکش قوتوں
کو اپنا مطیع و منقاد بنانے اور اُس موادِ فاسد کو خارج کر دینے سے
جو قوم کے نظام جسمانی کی صحت کے لئے مُضر تھا قوم کو نئے سرے
سے زندہ کر دیتے ہیں اور اُس کی اصلی توانائی اس کے اعضا میں
عود کر آتی ہے۔ اگرچہ قوم کی ذہنی و دماغی قابلیت کا دھارا افراد ہی
کے دماغ ہی سے ہو کر بہتا ہے۔ لیکن پھر بھی قوم کا اجتماعی نفسِ ناطقہ
جو مُدرِک کلیات و جزئیات اور خبیر و مرید ہے بجائے خود ضرور موجود
ہوتا ہے "جمہوری رائے" اور "قومی فطرت" وہ جملے ہیں جنکی وساطت
سے ہم موہوم و مبہم طور پر اس نہایت ہی اہم حقیقت کا اعتراف
کرتے ہیں کہ قومی ہستی ذوی العقل اور ذوی الارادہ ہے۔ اژدہامِ
خلائق۔ جلسۂ عام۔ جماعتِ انتظامی۔ فرقۂ مذہبی اور مجلس مشاورت
وغیرہ ذرائع ہیں جن سے قوم اپنی تدوین و تنظیم کا کام لیکر وحدت

ادراک کی غایت کو حاصل کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قومی دماغ تمام اُن مختلف خیالات کی خبر یا علم رکھتا ہو جو ایک وقت خاص میں افراد کے دماغوں میں موجود ہوتے ہیں اس لئے کہ خود افراد کا دماغ بھی کامل طور پر اپنی ادراکی حالتوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اجتماعی یعنی قومی دماغ میں بہت سے احساسات ومقامات وتخیلات قومی حاسہ کی دہلیز سے باہر رہتے ہیں۔ قوم کی ہمہ گیر دماغی زندگی کا فقط ایک جزو محدود دروازہ کے اندر قدم رکھتا ہے اور قومی ادراک کی تابناک شعاعوں سے منوّر ہوتا ہے۔ اس انتظام کی بدولت مرکزی اعضا کی توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار غیر ضروری جزئیات پر صرف ہونے سے محفوظ رہتی ہے +

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ قوم ایک جداگانہ زندگانی رکھتی ہے۔ یہ خیال کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ اپنے موجودہ افراد کا محض ایک مجموعہ ہے اصولاً غلط ہے اور اسی لئے تمدنی وسیاسی اصلاح کی تمام وہ تجاویز
ہوں بہت احتیاط کے ساتھ نظر ثانی کی محتاج
افراد کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ

پر اگر نظرِ غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غیر محدود و لاُمتناہی ہے۔
اِس لئے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں وُہ کثیر التّعداد آنے والی
نسلیں بھی شامل ہیں جو اگرچہ عمرانی حدِ نظر کے فوری منتہا کے پرلی طرف
واقع ہیں لیکن ایک زندہ جماعت کا سب سے زیادہ اہم جُزو متصوّر
ہونے کے قابل ہیں۔ علم الحیات کے اکتشافاتِ جدیدہ نے اس
حقیقت کے چہرے سے پردہ اُٹھایا ہے کہ کامیاب حیوانی جماعتوں کا
حال ہمیشہ استقبال کے تابع ہوتا ہے۔ مجموعی حیثیّت سے اگر نوع پر نظر
ڈالی جائے تو اس کے وُہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہُوئے اس کے
موجُودہ افراد کے مقابلہ میں شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ افراد
کی فوری اغراض اُن غیر محدود و نامشہود افراد کی اغراض کے تابع
بلکہ ان پر نثار کردی جاتی ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ بتدریج ظاہر ہوتے رہتے
ہیں۔ اور علم الحیات کی اس حیرت انگیز حقیقت کو وہ شخص بیگانۂ استغنا
نہیں دیکھ سکتا جس کے پیشِ نظر سیاسی یا تمدنی اصلاح ہے۔ میں اپنی قوم
کی موجُودہ عمرانی حرکت پر اسی پہلو سے نظر ڈالنا چاہتا ہُوں یعنی اسکی
تنقید ... بالی طور پر کرنا چاہتا ہُوں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو

اقوام کے لئے سب سے زیادہ مہتم بالشّان عقدہ فقط یہ عقدہ ہے (خواہ اس کی نوعیت تمدنی قرار دی جائے خواہ اقتصادی خواہ سیاسی) کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے۔ مٹنے یا معدوم ہو جانے کے خیال سے قومیں بھی ویسی ہی خائف ہیں جیسے افراد۔ کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی قابلیتوں اور استعدادوں کے محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی غایتُ الغایات سے کرنا چاہیئے۔ ہم کو لازم ہے کہ اپنے محاسن کو جانچیں اور پرکھیں اور اگر ضرورت آپڑے تو نئے محاسن پیدا کریں اس لئے کہ بقول نیٹشا کے کسی قوم کی بقا کا دار و مدار محاسن کی مسلسل و غیر مختتم تولید پر ہوتا ہے۔ کائنات یقیناً جناب باری کی حکمت بالغہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر اس کا مفہوم سرتاسر انسانی ہے۔ لیکن اس تبصرہ کے آغاز سے پہلے میں چند تمہیدی امور پر بحث کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ یہ بحث میرے نزدیک جماعت مسلمین کے متعلق کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ امور جن پر میں ترتیب وار نظر ڈالوں گا حسب ذیل ہیں

(۱) جماعت مسلمین کی ہیئت ترکیبی ؛

(۲) اسلامی تمدّن کی یکرنگی +

(۳) اس سیرت کا نمونہ جو مسلمانوں کی قومی ہستی کے تسلسل کے لئے لازمی ہے +

اوّلاً مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصوّر دوسری اقوام کے تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اُس برادری میں جو جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لئے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اسکی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصوّر پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً
[illegible] ۶۰۰ [illegible] کا آخر [illegible] کسی خاص قوم کے خصائلِ مخصوصہ
[illegible] اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قوم عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا
اس کی پولیٹکل نشو و نما میں بہت بڑا حصہ لیا لیکن اسلامی علوم و فنون
اور فلسفہ و حکمت کے انمول موتیوں کے رولنے کا کام اور بقیہ کام
ہی جوہر نفس ناطقہ انسانی کی اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے
زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ
اسلام کا ظہور قوم عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی ایک
آنی و عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی
یا شرار کا تبسم تھا۔ لیکن اسلام کی دائمی توانائیوں کا جولانگاہ عرب
نہ تھا بلکہ عجم تھا۔ پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خالص
طور پر ذہنی یا تخیلی ہے لہٰذا یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی
یا حسی اصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے۔ قومیت کا
ملکی تصور جس پہ زمانۂ حال میں بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے ہیں
اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے۔ اس میں
شک نہیں کہ قومیت کے جدید تصور نے چھوٹے چھوٹے پولیٹکل
حلقے قائم کرکے اور اُن میں رقابت کے اُس صحیح [illegible] پھیلا کر

(جس نے تمدن جدید کی شاخ میں بوقلمونی کا پیوند لگایا ہے) دنیا کو تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچایا ہے۔ لیکن بڑی خرابی اس تصور میں یہ ہو کہ اس میں غلو اور افراط کا شاخسانہ نکل آتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی نیتوں کی نسبت غلط فہمی پھیلا رکھی ہے۔ اس نے پولٹیکل سازشوں اور منصوبہ بازیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس نے فنونِ لطیفہ و علوم ادبیہ کو خاص خاص قوموں کی خصوصیات کی میراث قرار دیکر عام انسانی عنصر کو اس میں سے نکال دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے ایک طرح سے ایک مادی شئے کا تالیہ ہے جو سراسر اصولِ اسلام کے خلاف ہے اس لئے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرک خفی و جلی کا قلع و قمع کرنے کے لئے نمودار ہوا تھا۔ لیکن اس سے یہ نہ گمان کیا جائے کہ میں جذبۂ حبِّ وطن کا سرے سے مخالف

اتحاد حدودِ ارضی پر مبنی
سے حق بجانب ہے۔ لیکن
نہ ہوں جو اس امر کے

معترف ہونے کے باوجود کہ جذبۂ حبِّ وطن قومی سیرت کا ایک قیمتی عنصر ہے۔ ہم مسلمانوں کی عصبیّت کو نام دھرتے ہیں اور اسے وحشیانہ تعصّب کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ ہماری عصبیّت ایسی ہی حق بجانب ہے جیسی ان کی وطن پرستی۔ عصبیّت سے بجز اس کے اور کچھ مراد نہیں کہ اصُولِ حبِّ نفس بجائے اس کے کہ ایک فردِ واحد میں ساری دوائر ہو ایک جماعت پر اپنا عمل کرتا ہے۔ حیوانات کی تمام نوعیں کم و بیش ضرور متعصّب ہوتی ہیں۔ اور اگر انہیں اپنی انفرادی یا اجتماعی ہستی برقرار رکھنی ہے تو ضرور ہے کہ ان میں عصبیّت موجود ہو۔ اقوامِ عالم پر نظر ڈالئے۔ ایک قوم بھی ایسی نہ ہوگی جو پیرایۂ عصبیت سے عاری ہو۔ کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجئے۔ وہ بہت ہی کم متأثّر ہوگا۔ اس لئے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اُس اصُول کو مس نہیں کیا جو اُس کی قومیّت کی رُوح رواں ہے۔ لیکن ذرا اُس کے تمدّن اُس کے ملک یا بالعمل سرگرمیوں کے کسی شعبہ کے متعلّق اُس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل یا شعار پر نوخردہ گیری کر دیکھئے

عصبیت کا شعلہ بھڑک نہ اُٹھے تو ہم جانیں ۔ بات یہ ہے کہ فرانسیسی
کی قومیت کا انحصار اس کے معتقداتِ مذہبی پر نہیں ہے بلکہ
جغرافی حدود یعنی اس کے مُلک پر ہے۔ پس جب آپ اُس خاص
خطّۂ زمین پر جسے اُس نے اپنے تخیّل میں اپنی قومیّت کا اصلی
اصُول قرار دے رکھا ہے معترض ہوتے ہیں تو آپ اُس کی عصبیّت
کو واجبی طور پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت اس سے بالکل
مختلف ہے۔ ہماری قومیّت ایک شئے معہُود فی الذہن ہے موجُود
فی الخارج نہیں ہے۔ بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آکر جمع
ہوسکتے ہیں وہ مظاہرِ آفرینش کے متعلّق ایک خاص قسم کا اشراقی
سمجھوتا ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے پس اگر کسی کا ہمارے مذہب
کو بُرا کہنا ہماری آتشِ عصبیّت کو برافروختہ کرتا ہے تو میری دانست
میں یہ برافروختگی اُس فرانسیسی کے غصّہ سے کچھ کم واجبی نہیں ہے جو
اپنے وطن کی بُرائیاں سُن کر بھڑک اُٹھتا ہے۔ عصبیّت سے صرف
نگاہِ تنفّر دیکھنا اس کے
تان جب کبھی مجھے کسی خاص

مشرقی رسم یا طرزِ خیال کو کسی انگلش لیڈی یا جنٹلمین کے سامنے بیان کرنے
کا اتفاق ہوا تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس پر اظہارِ تعجب نہ کیا گیا ہو
جس سے مجھے رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے نزدیک
ہر غیر انگلش خیال گویا داخلِ عجائباتِ قدرت ہے۔ مجھے انگریزی قوم
کا یہ وطیرہ نہایت ہی پسند ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ قوم
پیرایۂ تخییل سے عاری ہے جس خاک سے شیکسپیر، شیلی،
کیٹس، ٹینی سن اور سوئنبرن پیدا ہوئے ہوں وہ بھلا خیال
آفرینیوں اور ذہانت آرائیوں سے کیونکر مبرا ہوسکتی ہے۔ البتہ
یہ بات ہمیں ماننی پڑتی ہے کہ انگلستان کا طریقۂ ماندوبود اور طرزِ
غور و فکر وہاں کے آئین و قوانین اور اس کے رسم و رواج
اس ملک کے رہنے والوں کی زندگی کے اجزائے لاینفک بنگئے ہیں
غرض مذہبی خیال بلا اس دینی اکتناز کے جو افراد کی آزادی
میں غیر ضروری طور پر خلل انداز ہو اسلامی جماعت کی ہیئتِ ترکیبی کا
مدار علیہ ہے۔ آگسٹس کونٹ کا قول ہے کہ چونکہ مذہب ہماری کل ہستی
پر حاوی ہے لہذا اس کی تاریخ ہماری ..... ہستی کا خلاصہ

ہونی چاہیئے" یہ قول جیسا ہماری قوم پر صادق آتا ہے ویسا کسی اور قوم پر نہیں صادق آتا لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا انتہائی مدار علیہ محض وہ چند معتقدات ہیں جن کی نوعیت مابعد الطبیعی ہے تو کیا یہ بنیاد نہایت ہی متزلزل نہیں ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ علومِ جدیدہ تیز با ترقی کر رہے ہیں اور ہر بات کے حُسن و قبح کو پرکھنا اور معقولات اور منطقی استدلال سے قدم قدم پر کام لینا ان علوم کا لازمہ قرار دیا گیا ہے۔ مشہور فرانسیسی مستشرق رنیان کا یہی خیال تھا اور دبے الفاظ میں اُس نے یہ اُمید ظاہر کی تھی کہ اسلام ایک دن دُنیا کے ایک بڑے حصے کی عقلی و اخلاقی پیشوائی کے منصبِ اعلیٰ سے گر جائیگا۔ جن اقوام کی اجتماعی زندگی کا اصل اصول حدود ارضی سے وابستہ ہوا انہیں معقولات سے خائف نہ ہونا چاہیئے لیکن ہمارے حق میں یہ ایک خطرناک دشمن ہے اس لئے کہ یہ اسی اصول کو مٹانا چاہتا ہے جس پر ہماری قومی ہستی

قابلِ فہم بنا رکھا ہے۔

سے اُس قومی شیرازہ کے

بکھر جانے کا اندیشہ ہی جو مذہبی قوت کا باندھا ہُوا ہی۔ اگرچہ اس میں
شک نہیں کہ ہم معقولات کا توڑ عقلی حربوں سے کر سکتے ہیں لیکن میں
جس بات پر زور دینا چاہتا ہُوں وُہ یہ ہی کہ اعتقاد یعنی ہمہ گیر وفاق
کا وُہ نکتہ جس پر ہماری جماعت کی وحدت منحصر ہی۔ ہمارے لئے
اپنے مفہوم کے لحاظ سے عقلی نہیں بلکہ قومی ہی۔ مذہب کو فلسفہ نظامی
بنانے کی کوشش کرنا میری رائے میں بے سُود محض بلکہ لغو و مہمل ہی
اس لئے کہ مذہب کا مقصد یہ نہیں ہی کہ انسان بیٹھا ہُوا زندگی کی
حقیقت پر غور کیا کرے۔ بلکہ اُس کی اصلی غایت یہ ہی کہ زندگی کی
سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لئے ایک مربوط و متناسب عمرانی نظام
قائم کیا جائے۔ مذہب سیرت انسانی کا ایک نیا اسلوب یا نمونہ پیدا
کرکے اس شخص کے اثر کے لحاظ سے جو اس سیرت کا مظہر ہی اس نمونہ
کو دُنیا میں پھیلانا چاہتا ہی اور اس طور پر چونکہ وہ ایک نئی دُنیا کو
نیست سے ہست کرتا ہے لہٰذا اس پر مابعد الطبیعات کا اطلاق
ہوتا ہی۔ میری مراد اُن تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی گئی ہیں یہ
ہی کہ اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں ۔۔ ۔۔ کہ

اس سے بہت بڑھ کر ہی۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہی اور ہماری قومی زندگی کا تصور اُس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ ہم اصُولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وُہ ابدی گھر یا وطن ہی جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہی وُہ اسلام کو ہم مُسلمانوں سے ہی۔ جہاں اسلامی اصُول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خُدا کی رسّی ہمارے ہاتھ سے چھُوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔

ثانیاً:۔

معتقداتِ مذہبی کی وحدت جس پر ہماری قومی زندگی کا دارُ مدار ہی اگر مضاف سے تعبیر کی جائے تو اسلامی تہذیب کی یک رنگی بمنزلہ اُس کے مضاف الیہ کے ہی۔ محض اسلام پر ایمان لے آنا اگرچہ نہایت ہی ضروری ہی لیکن کافی و مکتفی نہیں ہی۔ قومی ہستی میں شریک ہونے کی غرض سے ہر فرد کے لئے قلب ماہیت لازمی ہی اور اس قلب ماہیت کا ظاہری طور پر تو ارکان و قوانین اسلام کی

پابندی کرنی چاہیئے اور اندرونی طور پر اُس یک رنگ تہذیب و شائستگی سے استفادہ کرنا چاہیئے جو ہمارے آبا و اجداد کی متفقہ عقلی تحریک کا حاصل ہے۔ اسلامی جماعت کی تاریخ پر جس قدر زیادہ غور کیا جائے گا اُسی قدر یہ تاریخ حیرت انگیز و تعجب خیز نظر آئیگی۔ اُس دن سے جبکہ اسلام کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ سولہویں صدی کے آغاز تک یعنی تقریباً ایک ہزار سال کا زمانہ اس بے چین قوم نے ملک گیریوں اور جہاں کشائیوں میں صرف کیا۔ اگرچہ اس ہمہ گیر مشغلہ میں منہمک ہونے کے باعث انہیں کسی دوسرے شغل کی فرصت نہ ہوسکتی تھی لیکن پھر بھی اسلامی دُنیا نے علم و حکمت کے قدیم خزانوں کو ڈھونڈھ نکالا اور ان پر اپنی طرف سے معتدبہ اضافہ کر کے ایک عدیم النظیر لٹریچر کا سرمایہ دُنیا کے سامنے پیش کیا اور اس کے علاوہ ایک ایسے جامع و مانع

کے ہمہ گیر خیال کی مسلک میں منسلک کرنا اپنی غایت سمجھے ہوئے ہے
اسی طرح مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی کا معیار بھی عالمگیر ہے اور
انکا وجود اور نشو و نما کسی ایک قوم خاص کی دماغی قابلیتوں کا مرہون
منت نہیں ہے۔ البتہ ایران اس تہذیب شائستگی کی نشو و نما کا جزو
اعظم قرار پاسکتا ہے۔ اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ تاریخ اسلام کا
سب سے زیادہ اہم واقعہ کونسا ہے تو میں بلا تامل اس کا یہ جواب دونگا
کہ فتح ایران۔ معرکۂ نہاوند نے عربوں کو نہ صرف ایک دلفریب سرزمین
کا مالک بنا دیا بلکہ ایک قدیم قوم پر مسلط کردیا جو سامی اور آریہ مسالے
سے ایک نئے تمدن کا محل تعمیر کرنے کی قابلیت رکھتی تھی۔ ہمارا
اسلامی تمدن سامی تفکر اور آریہ تخیل کے اختلاط کا ماحصل ہے۔
جب ہم اس کے خصائل و شمائل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے
کہ اس کی نزاکت اور دلربائی اسے اپنی آریہ ماں کے بطن سے
اور اس کا وقار و ... اسے اپنے سامی باپ کے صلب سے
ترکہ میں ملا ہے۔ فتح ایرا ... ات مسلمانوں کو وہی گرانمایہ متاع
ہاتھ ... باعث اہل ... کے حصہ میں آئی تھی۔ اگر

ایران نہ ہوتا تو ہمارے تمدن کی تصویر بالکل ایک رخی ہوتی۔

یہاں ضمناً اس امر کا ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ قوم جس کے اختلاط نے عربوں اور مغلوں کی شکل ہی بدل دی عقلی وادراکی لحاظ سے مردہ نہیں ہے ایران جس کی پولیٹیکل آزادی کو روس کی غاصبانہ آرزوؤں نے معرض خطر میں ڈال رکھا ہے ابھی تک اسلامی تہذیب کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اور ہم لوگوں کی دلی تمنا ہے کہ اسلامی دنیا میں اس کا وہ درجہ جو اب تک قائم رہتا چلا آیا ہے بدستور قائم رہے۔ ایران کے شاہی خاندان کے لئے ایران کی پولیٹیکل آزادی کا فقدان فقط اس کا ہم معنی ہوگا کہ زمین کا ایک ٹکڑا اس کے قبضہ سے نکل گیا۔ لیکن اسلامی تہذیب کے لئے یہ واقعہ تیرھویں صدی کے تاتاری حملہ سے بھی زیادہ بلاخیز و مصیبت انگیز ہوگا۔ بہرحال یہ ایک پولیٹیکل بحث ہے جس میں میں اس وقت نہیں پڑنا چاہتا۔ میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جماعت مسلمین کا زندہ رہنے کے لئے انسان کو نہ

خُم میں غوطہ لگانے کا مُدعا یہ ہے کہ مُسلمان دو رنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جائیں اُن کا ذہنی منظر ایک ہو۔ وُہ مظاہر آفرینش پر ایک خاص پہلو سے نظر ڈالیں۔ اشیاء کی اہمیت اور قدر و قیمت کو اس انداز خاص کے ساتھ جانچیں جو جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کا مابہ الامتیاز ہے اور جو مسلمانوں کو ایک غایت مخصوص و مقصود معیّنہ کے پیرایے سے آراستہ کر کے انہیں کُلّ مُؤمِنٍ اِخْوَۃٌ کی کتاب کے اوراق بنا دیتا ہے۔

ثالثاً:۔ شق ثانی کے تحت میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلامی سیرت کے نمونے کی نمایاں خصوصیات کیا کیا ہونی چاہئیں لیکن یہ جتا دینا ضروری ہے کہ سیرت کے وہ مختلف پہلو جنہیں ایک قوم پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے بخت و اتفاق کی کورانہ قوتوں ہی کا حصل نہیں ہیں۔ زمانۂ حال کا علم عمرانیات ہمیں یہ نکتہ سکھاتا ہے کہ قوموں کا اخلاقی تجربہ چند خاص قوانین معیّنہ کا تابع ہوا کرتا ہے رز انہ قا نا منہ جب کہ زندہ رہنے کے لئے انسان کو سپنہ ... عی اور دماغی قابلیتوں کے مقابلہ میں

وُہ جسمانی قوتوں سے زیادہ کام لیتا تھا تو اسی شخص کی سب تعریف و تقلید کرتے تھے جو شجاع ہوتا تھا۔ جب جہد للبقا کی کشمکش فرو ہوئی اور خطرہ زائل ہو گیا تو دورِ شجاعت گیا اور بااصلاح گذشتہ دورِ مروت آیا جس میں جرأت و دلاوری اگرچہ پھر بھی مستحسن سمجھی جاتی تھی۔ لیکن انسانی سیرت کا ہر دلعزیز اور عام پسند نمونہ وُہ شخص متصور ہوتا تھا جو لطائفِ عمر کی ہر صنف کا رسیا ہو اور فیاضی و ایثار اور ہم نوائی و ہم پیالگی کے گوناگون اوصاف سے متصف ہو۔ لیکن چونکہ ان دونوں اسالیب کا میلان غلو و افراط کی جانب تھا لہٰذا ان کے عمل کا رد ایک تیسرے نمونہ یا اسلوب نے کیا جس کی غایت الغایت ضبطِ نفس ہے اور جو زندگی پر زیادہ متانت و تقشف کے ساتھ نظر ڈالتا ہے۔ ہندوستان میں جب ہم اسلامی جماعت کے ارتقا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نمود اسلوب اوّل کا مظہر نظر آتا ہے بابر اسالیب اول دوم کے امتزاج کو ظاہر کرتا ہے

کی اسلامی قومیت کی نشوونما کا نقطۂ آغاز ہیں اسلوب ثالث کا چہرہ کشا ہے۔ اُن لوگوں کے نزدیک جنہوں نے عالمگیر کے حالات تاریخ ہند کے مغربی شارحین کی زبانی سُنے ہیں۔ عالمگیر کا نام سفاکی وقساوت جبر و استبداد۔ مکّاری و غدّاری اور پولٹیکل سازشوں اور منصوبوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ خلط مبحث کا خوف مانع ہے ورنہ میں معاصرانہ تاریخ کے واقعات کی صحیح تعبیر و تفسیر سے ثابت کرتا کہ عالمگیر کی پولٹیکل زندگی کی وجوہ تحریک سراسر جائز و حق بجانب تھیں اس کے حالات زندگی اور اس کے عہد کے واقعات کا بنظر انتقاد مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقینِ واثق ہو گیا ہے کہ جو الزامات اُس پر لگائے جاتے ہیں وہ واقعات متعاصرہ کی غلط تعبیر اور اُن تمدّنی و سیاسی قوتوں کی غلط فہمی پر مبنی ہیں جو ان دنوں سلطنتِ اسلام کے طول و عرض میں عمل کر رہی تھیں۔ میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سانچہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا [illegible] ہے اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ [illegible] ہے اور مسلمان ہر وقت اسے پیش نظر رکھیں۔

۱۔ مذہبی خیال اسلامی جماعت کا سرچشمۂ زندگانی ہے۔ اس جماعت کی صحت و توانائی کے قائم رکھنے کے لئے اُن مخالف قوتوں کی نشوونما کو جو اس کے اندر کام کر رہی ہیں بغور دیکھتے رہنا چاہیئے۔ اور خارجی عناصر کی صریح آمیزش سے اوّل تو بچانا اور یا اگر آمیزش منظور ہی ہو تو اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ یہ آمیزش آہستہ آہستہ اور بتدریج ہو تاکہ نظام مدنی کی قوّتِ آخذہ اور جاذبہ پر زیادہ زور نہ پڑے اور اس طور پر یہ نظام بالکل ہی درہم و برہم نہ ہو جائے۔

۲۔ جماعت اسلامی سے جس فرد کو تعلق ہو اُس کا ذہنی سرمایہ اس دولت سے ماخوذ ہونا چاہیئے جو اس کے آبا و اجداد کی دماغی قابلیتوں کا ماحصل ہے تاکہ وہ ماضی و استقبال کے ساتھ حال کے ربط و تسلسل کو محسوس کرتا رہے۔

۳۔ اس کے خصائل و شمائل اس خاص اسلوب سیرت کے مطابق ہوں جس کو میں نے [illegible] اسلوب سے تعبیر

اب میں تمدن کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے قومی کارناموں کی قدر و قیمت کا جائزہ لینا ہوں۔ اسلامی دنیا نے جہانبانی۔ مذہب۔ ادب۔ حکمت۔ درس و تدریس۔ وقائع نگاری صنعت و حرفت اور تجارت کی اصناف میں جو جو کام کیا ہے اس کی مبسوط تنقید کئی ضخیم جلدوں کی محتاج ہوگی۔ عالم اسلام میں جو واقعات اس وقت پیش آرہے ہیں وہ نہایت ہی معنی خیز ہیں۔ اور اُن پر تفحص کی نگاہ ڈالنا بہت کچھ سبق آموز ثابت ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ کام بیحد محنت طلب ہے اور میں اس کی انجام دہی سے قاصر ہوں۔ اس لئے میرا تبصرہ فقط مسلمانانِ ہند کے کارناموں سے متعلق ہوگا۔ اگرچہ اس موضوع پر بھی اُن مختلف مسائل کی نسبت جو ہمیں درپیش ہیں۔ میں شرح و بسط کے ساتھ رائےزنی نہ کرسکوں گا۔ میں صرف دو امور سے بحث کرونگا:-

(۱) تعلیم اور

(۲) عامۂ خلائق کی عام حالت کی اصلاح۔

گذشتہ پچاس سال کے دوران میں مسئلہ تعلیم ہماری ہمتوں

اور سرگرمیوں کا نصب العین بنا رہا ہے۔ یہ سوال کرنا بیجا نہ ہوگا
کہ آیا اشاعتِ تعلیم میں ہم نے کسی خاص غایت کو پیشِ نظر رکھا ہے
یا استقبال کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو کر محض حال کی
فوری اغراض کا لحاظ کیا ہے؟ ہم نے کس قسم کے تعلیم یافتہ اشخاص
تیار کئے ہیں؟ آیا ان اشخاص کی قابلیت ایسی ہے کہ ہم مسلمانوں
کی سی مخصوص الترکیب جماعت کی عمرانی ہستی کے تسلسل کی کفیل ہوسکے!
ان سوالات کے جوابات کنایتہً پہلے ہی دیئے جا چکے ہیں۔
علم النفس کے اصول سے جو لوگ واقف ہیں انہیں اچھی طرح معلوم
ہے کہ نفسِ ناطقہ کی وہ کیفیت جسے استبصار یا ہشیاری سے
تعبیر کرتے ہیں۔ ذہنی حالتوں کے باقاعدہ تواتر پر منحصر ہوتی ہے۔
جب نفسِ ناطقہ کے سلسلہ ہشیاری میں خلل واقع ہو جاتا ہے تو نفس
بیمار پڑ جاتا ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ قوائے حیوانی رفتہ رفتہ
تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت اقوام کے نفسِ ناطقہ کی ہے جس کا
تسلسل اس اجتماعی تجربہ کے باقاعدہ انتقال پر ہے جو نسلاً بعد نسلٍ
قوم کو اپنے اسلاف سے میراث میں ملتا رہتا ہے تعلیم کا مقصد

یہ ہے کہ اس توارث متوالیہ کی مُؤید ہوکر نفس ناطقہ قومی کو استعداد کا
اہل بنائے تاکہ وہ اپنی ذات کے ادراک پر قادر ہوسکے ۔ فرد کا رابطہ
اتحاد اس قوم کے ساتھ جس کا وہ جزو ہے اگر بڑھ سکتا ہے تو اسی انتہ
کوشش سے ۔ تعلیم کے ذریعہ سے روایات مجتمعہ کے جو مختلف اجزا
اس طور پر منتقل کئے جاتے ہیں وہ نفس ناطقہ قومی میں جذب اور پیوست
ہوکر اُن چند افراد قوم کے لئے میل و فرسنگ کا کام دیتے ہیں جن کی
پوری زندگی اور کل قابلیت غور و فکر قوم کے مختلف غایات و مقاصد
کی منزلیں طے کرنے میں گذر جاتی ہے ۔ مثلاً ایک قوم کی قانونی
تاریخی اور علمی روایات اس قوم کے مقننوں مورخوں اور الشاپردازو
کی چشم بصیرت کے سامنے ہر وقت ایک نمایاں شکل میں موجود رہتی ہیں
اگرچہ قوم کو مجموعی حیثیت سے اُن روایات کا ادراک موہوم و مبہم طور
پر ہوتا ہے ۔ اس نقطۂ خیال سے اگر ہم اپنے تعلیمی کارناموں کی قدر
وقیمت کا اندازہ لگائیں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان
قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا
حاصل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ

نہیں ہے۔ حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وُہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وُہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دُنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقاید کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولانگاہ بنا ہوا ہے اور میں علیٰ رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشہ میں ہر وقت سرشار رہکر اُس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔ بلاخوف تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دُنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں۔ جیسی ہماری قوم نے لیکن با ایں ہمہ ہمارے نوجوان کو جو اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے۔ مغربی تاریخ کے مشاہیر سے استحساناً واستہداءً رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقلی دادراکی لحاظ سے وُہ مغربی دُنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسکی رُوح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد

میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا شرکتِ احدے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔ کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبر سے زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کیا جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظر غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پکار اٹھتے ہیں :-

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کنایہ ہے ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اس قدامت انتساب نام لیوا سے جو مغربی تعلیم کے بارہ میں سر سید احمد خاں مرحوم کے ساتھ مدت العمر لڑا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ

ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کڑوی کسیلی باتوں کے سُننے والے مجھے معاف فرمائینگے۔ آج کل کی طالب العلمانہ زندگی سے چونکہ گذشتہ دس بارہ سال کی مدت میں مجھے سابقہ پڑتا رہا ہے اور میں ایک ایسے مضمون کا درس دیتا رہا ہُوں جس کو مذہب سے قریب کا تعلق ہے لہذا میں اِس بات کا تھوڑا بہت استحقاق رکھتا ہوں کہ میری باتیں سُنی جائیں مجھے رہ رہ کر یہ تلخ تجربہ ہُوا ہے کہ مسلمان طالب العلم جو اپنی قوم کے عمرانی اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے رُوحانی طور پر بمنزلہ ایک بیجان لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورت حالات اور بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی رُوح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائیگی۔ وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مُسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز کلام مجید کی تعلیم سے ہونا چاہئیے وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ باخبر تھے۔ ہماری قومی سرگرمیوں کی محرک اقتصادی اغراض ہی نہیں ہونی

چاہئیں۔ قوم کی وحدت کی بقا اور اس کی زندگی کا تسلسل قومی آرزوں کا ایک ایسا نصب العین ہے جو فوری اغراض کی تکمیل کے مقابلہ میں بہت زیادہ اشرف و اعلیٰ ہے۔ ایک قلیل البضاعت مسلمان جو سینہ میں ایک ذرد بھرا اسلامی دل رکھتا ہو میری رائے میں قوم کے لئے بمقابلہ اس بیش قرار تنخواہ پانے والے آزاد خیال گریجوایٹ کے زیادہ سرمایہ نازش ہے جس کی نظروں میں اسلام اصولِ زندگی نہیں ہے بلکہ محض ایک آلۂ جلبِ منفعت ہے جس کے ذریعہ سے بڑے بڑے سرکاری عہدے زیادہ تعداد میں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ میری ان باتوں سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں مغربی تہذیب کا مخالف ہوں۔ اسلامی تاریخ کے ہر مبصّر کو لامحالہ اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہمارے عقلی و ادراکی گہوارے کو جھلانے کی خدمت مغرب ہی نے انجام دی ہے۔ فلسفیانہ تخیل کی سرزمین

ہیں ہم شاید ابھی تک بجائے عربی یا ایرانی ہونے کے زیادہ تر یونانی نظر آرہے ہیں۔ بایں ہمہ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ خود ہماری خالص اسلامی تہذیب اپنی مثال آپ ہے اور تعلیم کا کوئی جدید اسلامی نظام متعلّمین کی قومیّت پر حرف لائے بغیر اس کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اسلامی یونیورسٹی کے خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں ایک مبارک علامت ہے۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیّت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس قسم کے دار العلم کی ضرورت میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی بشرطیکہ یہ دار العلم ٹھیٹھ اسلامی اصول پر چلایا جائے۔ کوئی قوم اس رشتہ کو یک بیک نہیں توڑ سکتی جو اسے اس کے ایّام گذشتہ سے جوڑے ہوئے ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے جن کی مجموعی روایات ان کی قومیت کی جان ہیں۔ مسلمان

کو بیشک علوم جدیدہ کی تیز پا رفتار کے قدم بقدم چلنا چاہیئے لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی قومی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں۔ ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اُٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آب حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکّے مُسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو بوجہ کسی اکتنازی یا اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھیگا اور گرد و پیش کی اُن قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائیگا جس میں اس کی بہ نسبت زیادہ قوّت و جان ہوگی۔

لیکن ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک

اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے
عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علما اور واعظ انجام دے رہے
ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں۔ اسلئے
کہ اُن کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی
محدود ہے۔ اخلاق اور مذہب کے اصُول و فروع کی تلقین کے
لئے موجودہ زمانہ کے واعظ کو تاریخ اقتصادیات اور عمرانیات کے
حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور
تخیل میں پُوری دسترس رکھنی چاہیئے۔ الندوہ۔ علیگڈھ کالج۔
مدرسۂ دیوبند اور اسی قسم کے دُوسرے مدارس جو الگ الگ کام
کر رہے ہیں اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے۔ ان تمام بکھری
ہُوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دارالعلم
ہونا چاہیئے جہاں افرادِ قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو و نما
دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار
کیا جا سکے جس میں زمانہ موجودہ کے ہندوستانی مُسلمان کو ڈھلنا
چاہیئے پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی

دارالعلم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجیب دلکش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر پیشانی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے اعلیٰ تخییل۔ زمانہ کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کو تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔

اس بحث کے خاتمہ سے پہلے میں مسلمان عورتوں کی تعلیم کے متعلق چند کلمات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسلام میں عورتوں کا جو درجہ ہے اس پر تفصیلی رائے زنی کرنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن کھلے لفظوں میں اس امر کا اعتراف میں ضرور کرونگا کہ بفحوائے آیۂ کریمہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ میں مرد اور عورت کی مساوات مطلق کا حامی نہیں ہو سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ قدرت نے ان دونوں کے تفویض جدا جدا خدمتیں کی ہیں اور ان فرائض جداگانہ کی صحیح اور باقاعدہ انجام دہی خانوادۂ انسانی کی صحت و فلاح کے لئے لازمی ہے۔ مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی

اِقتصادی حالت پیدا کردی ہے۔ عورتوں کا آزاد کردیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے اُلٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظامِ معاشرت میں اِس سے پیچیدگیاں واقع ہو جائینگی۔ اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے بھی جس حد تک کہ افرادِ قوم کی شرح ولادت کو تعلق ہے جو نتائج مترتب ہونگے وُہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہونگے۔ مغربی دُنیا میں جب عورتوں نے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر کسبِ معاش کی جدوجہد میں مردوں کا ساتھ دینا شروع کیا تو خیال یہ کیا جاتا تھا کہ اُن کی یہ اقتصادی حُریّت دولت کی پیداوار میں معتدبہ اضافہ کریگی لیکن تجربہ نے اس خیال کی نفی کردی۔ اور ثابت کردیا کہ اُس خاندانی وحدت کے رشتہ کو جو بنی نوعِ انسان کی رُوحانی زندگی کا جُزوِ اعظم ہے یہ حُریّت توڑ دیتی ہے۔

مَیں اس حقیقت کے اعتراف کے لئے آمادہ ہُوں کہ زمانہ حال میں کسی جماعت کا محض مقامی قوتوں کے ذریعہ سے نشو ونما پانا محال ہے۔ ریل اور تار نے زمان اور مکان کے پردہ کو درمیان

سے اُٹھا سا دیا ہے اور دُنیا کی مختلف قومیں جن میں پہلے بُعد المشرقین حائل تھا اب پہلو بہ پہلو بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس ہم نشینی کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ بعض قوموں کی تو حالت بدل کر رہ جائیگی اور بعض قومیں بالکل ہی ملیا میٹ ہو جائینگی۔ جو عظیم الشان اقتصادی عمرانی اور سیاسی قوتیں اس وقت دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں اُن کے نتائج کے بارہ میں کوئی شخص پیش بندی کی راہ سے رائے زنی نہیں کرسکتا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ گو کسی قوم کے لئے بغرض تکمیل صحت اپنی تمدنی آب و ہوا کی تبدیل کے طور پر کسی غیر قوم کے تمدن کے عناصر کا اخذ و جذب کرنا قرین مصلحت بلکہ لازمی ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اغیار کی تقلید میں شتاب زدگی اور بے سلیقگی سے کام لیا گیا تو نظام قومی کے اعضاء رئیسہ میں اختلال عظیم کے پیدا ہونے کا خطرہ ہوگا۔ اقوام کے تمدن میں ایک پہلو عمومیت کا ہوا کرتا ہے لیکن اُنکی معاشرت کی رسموں اور سیاسی دستوروں میں خصوصیت شخصی کی شان نظر آتی ہے۔ یہ رسوم اور یہ دستورات ان

قوموں کی تاریخی زندگی اور ان کی خاص روایات سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ پس اپنی قوم کی خاص نوعیت اسلام کی تعلیم اور عالم نسوان کے متعلق علم الاعضا و علم الحیات کے انکشافات کو مدنظر رکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسلمان عورت کو جماعت اسلامی میں بدستور اسی حد کے اندر رہنا چاہیئے جو اسلام نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے اور جو حد کہ اُس کے لئے مقرر کی گئی ہے اُسی کے لحاظ سے اس کی تعلیم ہونی چاہیئے۔

میں نے سطور بالا میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہماری جماعت کا شیرازہ اُسی وقت تک بندھا رہ سکتا ہے جب تک کہ مذہب اسلام اور تہذیب اسلام کو ہم پر غالب رہے۔ چونکہ عورت کے دل و دماغ کو مذہبی تخییل کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے لہذا قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لئے یہ بات نہایت ہی ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو اُن کو اسلامی تاریخ۔ علم تدبیر خانہ داری اور علم اصول حفظ صحت پڑھایا جائے۔ اِن سے آگے

دماغی قابلیتیں اس حد تک نشو و نما پا جائینگی کہ وُہ اپنے شوہروں سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گی اور امومت کے وُہ فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکینگی جو میری رائے میں عورت کے فرائض اوّلین ہیں۔ تمام وُہ مضامین جو ان کی نسائیت کی نفی کرنے یا اسلام کی حلقہ بگوشی سے انہیں آزاد کرنے والے ہوں باحتیاط اُن کے نصاب تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں۔ لیکن ہمارے نکتہ آموز ابھی تک اندھیرے میں رستہ ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک ہماری لڑکیوں کے لیے کوئی خاص نصاب تعلیم معیّن و مرتب نہیں کیا۔ اور اُن میں سے بعض بزرگواروں کی آنکھیں تو مغربی تصورات کی روشنی سے ایسی چندھیا گئی ہیں کہ وُہ ابھی تک اسلام میں جو قومیّت کو ایک خاص ذہنی کیفیت یعنی مذہب پر منحصر قرار دیتا ہے اور مغربیت میں جس نے قومیّت کا محل ایک خارجی مواد یعنی وطن کی بنیاد پر تعمیر کیا ہے کوئی فرق نہیں سمجھ سکے ؎

اب مَیں چند خیالات اپنی قوم کے غُربا کی عام حالت کی

اصلاح کے متعلق ظاہر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں عام طبقہ کے مسلمانو
کی اقتصادی حالت سب سے پہلے ہمیں اپنی طرف متوجّہ کرتی ہے
یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی
اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابلِ رحم ہے۔
شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں معمولی درجہ
کے مسلمانوں کی قلیل اجرت غلیظ مکان اور اُن کے پیٹ بھر
روٹی کو ترستے ہوئے بچّوں کا حسرتناک نظارہ کس نے نہیں
دیکھا؟ لاہور کے کسی اسلامی محلّہ میں جا نکلو۔ ایک تنگ و تاریک
کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم
کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچّوں کی چیخ پکار یا کسی پردہ نشین
بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھائی
ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لیے پھیلی ہوئی
ہونگی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو
تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن
دیکھے تھے۔ لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک

دانہ تک منہ میں اُڑ کر نہیں گیا لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پسارین۔ ہمارے نوجوان علَم برداران اصلاحِ تمدن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قُوا کے روزافزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں شاید یہ نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمّہ دار پردہ نہیں بلکہ یہ جان فرسا افلاس ہے جو ہماری قوم کے ادانی و اقاصی کو کھائے جارہا ہے۔ علاوہ اس افلاس زدہ طبقہ کے ایک اور طبقہ اُن نکمّے اور نکھٹّو افراد کا ہے۔ جو اپنے جیسی ناکارہ اولاد پیدا کرکے سُستی و کاہلی اور بداعمالی و بے کرداری کی زندگی خود بھی بسر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنا سا بنا دیتے ہیں۔ کیا ہم نے تمدنی عقدہ کے اُن پہلوؤں پر بھی کبھی نظر ڈالی ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ہماری انجمنوں اور مجلسوں کا فرض یہ نہیں ہے کہ خاص خاص اشخاص کی کُلاہِ اعزاز و افتخار میں بیٹھے ہوئے طُرّے لگایا کریں بلکہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی سطح کو اونچا کریں؟ سب سے زیادہ اہم عقدہ اُس مُسلمان کے سامنے جو قومی کام

کے لئے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے یہ ہے کہ کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سُدھارے۔ اُس کا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظرِ غائر ڈال کر اُن اسباب کا پتہ لگائے جنہوں نے مُلک کی یہ حالت کر دی ہے۔" اُس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ مُلک کی اس حالت میں کس حد تک اُن بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصّہ لیا ہے جو آجکل کی دُنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں۔ کس حد تک اہلِ مُلک کی تاریخی روایات عادات اوہام اور اخلاقی کمزوریوں نے حصّہ لیا۔ اور اگر گورنمنٹ کے طرزِ عمل کا بھی اس میں کوئی حصّہ ہو تو وہ کس حد تک ہے؟ جو شخص اس گتھی کو سُلجھانے کا بیڑا اُٹھائے اُسے چاہئے کہ مذہب و ملت کے اختلاف کی طرف سے مُطلقاً خالی الذہن ہو جائے اور کسی ایک جماعت کی طرفداری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے۔ اِس لئے کہ اقتصادی قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں۔ شرح مالگذاری کا آئے دن کا اضافہ، مُسکرات ممالکِ غیر کی اس مُلک میں درآمد، قیمت

اجناس کی گرانی (خواہ اس گرانی کا باعث یہ ہو کہ سکۂ رائج الوقت کے متعلق حکومت کے قائم کیے ہوئے اصول غلط ہیں یا یہ ہو کہ ایک زراعتی ملک اور ایک صنعتی ملک کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ قائم کر دیا گیا ہے یا کوئی اور سبب ہو) یہ تمام امور ایسے ہیں جو مسلمانوں ہندوؤں۔ سکھوں اور پارسیوں کی اقتصادی حالت پر یکساں مؤثر ہو کر نہایت بلند آہنگی سے منادی کر رہے ہیں کہ مختلف جماعتوں کے اہل الرائے اور مقتدا اگر اور باتوں میں نہیں تو اقتصادیات میں تو ضرور آپس میں سر جوڑ کر مشورہ کر سکتے ہیں اور ملک کی مشترکہ فلاح کی تدابیر پر غور کر سکتے ہیں لیکن مسلمان پیشوایانِ قوم نے اب تک اپنی تمام توجہ اس مسئلہ پر صرف کیے رکھی ہے کہ سرکاری نوکریاں ہم لوگوں کو بحصۂ رسدی ملتی رہیں۔ یہ کوشش بجائے خود ضرور قابلِ ستائش ہے اور تاوقتیکہ مسلمانوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو۔ ہمارے سربرآوردگانِ ملت کو برابر اس کوشش میں سرگرمی کے ساتھ مصروف رہنا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی انہیں مدِ نظر رکھنی چاہیے کہ دولت کی پیداوار کا ذریعہ ہونے

کے لحاظ سے سرکاری ملازمت ایک نہایت ہی محدود ذریعہ ہے۔ سرکاری ملازمت محدود ہے۔ چند اشخاص کو ضرور آسودہ و خوشحال بنا دیتی ہے لیکن قوم کے تمام افراد اُسی صورت میں آسودہ و خوشحال ہو سکتے ہیں جبکہ اُن کو اقتصادی آزادی نصیب ہو۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اگر کسی قوم کے چند افراد حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوں تو اس قوم کی عزت اور خودداری میں چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ اقتصادی سرگرمی کے اور بہت سے اصناف ایسے ہیں جو اہمیت اور سودمندی میں سرکاری ملازمت کے لگ بھگ ہیں۔ جس قوم کو اپنے اسلاف سے سپاہیانہ روایات ترکہ میں پہنچی ہوں اس کے لئے سپہگری کے تصورات کو چھوڑ کر تجارت اور صنعت و حرفت کی ڈگر پر پڑ لینا یقیناً تکلیف دہ ہے لیکن چونکہ مغربی اقوام کی دیکھا دیکھی ایشیا کی تمام قوموں کی اقتصادی حالت تغیر پذیر ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ کودوں تو دلنی ہی پڑے گی۔ علاوہ ان اقتصادی مشکلات کے رفع کرنے کے جو ہماری سنگ راہ ہیں ہمیں صنعتی تعلیم پر بھی

ضرور اپنی توجہ صرف کرنی چاہیئے جو میری رائے میں اعلیٰ تعلیم سے
بھی زیادہ ضروری ہے۔ صنعتی تعلیم سے عامۂ خلائق کی اقتصادی
حالت سُدھرتی ہے اور یہی طبقہ قوم کے لیے بمنزلۂ ریڑھ کی ہڈی
کے ہے۔ بخلاف اِس کے اعلیٰ تعلیم صرف اُن چند افراد کو نفع
پہنچاتی ہے۔ جن کی دماغی قابلیت درجہ اوسط سے بڑھی ہوئی
ہوتی ہے۔ ہمارے اغنیا کے بذل وجود کا مصرف ایسا ہونا
چاہیئے کہ عام مسلمانوں کے بچّے ارزاں صنعتی تعلیم حاصل
کرسکیں۔ لیکن صنعتی اور تجارتی تعلیم بلا کسی اخلاقی تربیت کے
بجائے خود کافی و مکتفی نہیں ہے۔ اِقتصادی مقابلہ میں
تربیت کے اخلاقی عنصر کی کچھ کم ضرورت نہیں پڑتی۔ اعتمادِ باہمی
دیانتداری۔ پابندیٔ اوقات اور تعاوُن وہ اقتصادی اوصاف
ہیں جو مہارت فن کی برابر کی جوڑ ہیں۔ ہندوستان میں بہت
سے کارخانے محض اس لئے نہ چل سکے کہ کارخانہ داروں کو
نہ ایک دُوسرے پر بھروسہ تھا اور نہ اصُولِ امداد باہمی اُن کا
رہنما تھا۔ اگر ہم اچھّے کاریگر اچھے دوکاندار اچھے اہلِ حرفہ

اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) اچھّے شہری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ انہیں اوّل پکّا مسلمان بنائیں ✤

تمّت
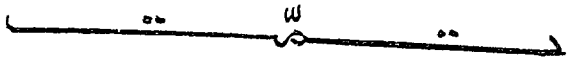
انگریزی لیکچر
از ڈاکٹر اقبال ایم۔اے

مترجم ظفرعلی بی۔اے
(علیگ)

ایک ہی سائز کی قومی نظمیں نہایت دلکش شان ہیں

شکوہ (مصنفہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے) خدا کی جناب میں نیازمندانہ شکایتیں مع پکچر قیمت	۱
ترانہ " " مسلمان بچوں کیلئے قومی گیت (جلی قلم)	۲
مکمل ترانہ " " مسلمان بچوں کے لئے تین گیت یعنی قومی - ملکی - وطنی (البتہ قلم جلی)	۱
نالۂ یتیم " " ایک لاوارث بچے کی حقیقت حال مع پکچر	۲
فریاد امت " " (دوسرا ایڈیشن) امت کے موجودہ حال زار کا اظہار	۲
تحفۃ الاخوان (مصنفہ جناب مولانا حالی) نہایت موثر اور دردمندانہ نظم	۴
شکریہ یورپ (مصنفہ جناب آغا حشر صاحب کاشمیری) دوسرا ایڈیشن مع تمہید جلی قلمی	۲
انتخاب جدید (یا قومی نظموں کا مجموعہ) مختلف نامی گرامی شعراء کے انتخاب کا جواب	۸
اخوت (مصنفہ جناب خان احمد حسین خان صاحب بی اے) یہ نظم قومی اپنی طرز میں عمدہ ہے	۱
میرا خواب " " " شاعر نے خواب کو عجیب پیرایہ میں بیان کیا ہے	۱
ہمارا قرآن " " " قرآن پاک کا قوم خوابیدہ سے خطاب	۱
تصویر یتیمی " " " یہ نظم حسرت بھری تصویر ہے جو شاعر کے دل کا نچوڑ ہے	۱
یتیموں کی فریاد (مصنفہ جناب آغا شاعر صاحب قزلباش دہلوی) یہ نظم زبان کی ستھری زبانِ اردو کا صحیح اردو دیتی ہے اور قابل شاعر کے دل پُر درد کا نظارہ ہے	۱
فریاد اسلام (مصنفہ جناب حکیم نواب علی صاحب برق) دوسرا ایڈیشن اضافہ کے ساتھ	۱
سوز بیوہ - ایک باعصمت عورت عالم شباب میں بیوہ ہو جاتی ہے اور اس کے حسرت بھرے کلمات ایک قابل شاعر کی زبانی ادا ہوں تو کیسے ہو سکتا ہے کہ سنگدل سے سنگدل بھی آنسو نہ بھر لائے (مع تصویر بیوہ)	۲
تصویر درد اس دردبھری تصویر کے کھینچنے والے بانی دوران فخر قوم ڈاکٹر اقبال ہیں - یہ نظم اپنی نوعیت میں لاجواب ہے - اسکے اہم بنانے کے لئے ڈاکٹر صاحب کا فوٹو بھی ہمراہ ہے قیمت	۴

درخواستیں بنام مینیجر مرغوب ایجنسی لاہور آنی چاہئیں

مرغوب ایجنسی لاہور

کی

خصوصیتیں

۱ - علمی کتب کو نہایت صحت، صفائی، اعلیٰ کمال اور چھپائی کے ساتھ
اچھے مضبوط چکنے سفید ولایتی کاغذ پر چھاپ کر شائع کرنا۔

۲ - مذاقِ سلیم رکھنے والے علم دوست حضرات یعنی اصحاب کے
ذوق کے موافق بنانے اور خوبصورت ٹائیٹل پیج سے دل
لبھانے والے دیدہ زیب شکلوں سے نکالنا۔

۳ - معمولی اور لچر تصانیف سے قطع نظر کر کے نامور و لائق حضرات
شعراء و مصنفین کا کلام چھاپ کر ان کی محنت کو ٹھکانے لگانا۔

۴ - درخواست کی تعمیل حتی الامکان جلد تعمیل کرنا۔ اگر کسی خاص وجہ
سے دیر ممکن ہو تو وجہِ تعویق سے درخواست کنندگان کو اطلاع
دینا۔ وغیرہ وغیرہ

منیجر [illegible]